طنز ومزاح کی نثری روایت اور ترقی پسند مصنّفین

ڈاکٹر عظمیٰ فرمان فاروقی*

Abstract:

Progressive literary movement used the satire & humour as a tool in literature in order to bring reforms in the society. In this article an attempt has been made to review the tradition of humour and satire in Urdu Literature and to determine the contribution and impact of Progressive Movement in using social satire and irony .

نثر اگرچہ ادب کا حصہ ہے تاہم اس کے تقاضے اور بنیادی صفات شاعری سے مختلف ہیں۔ یہ تقاضے اس قدر مختلف ہیں کہ بعض اوقات جو باتیں شاعری میں حسن کا درجہ رکھتی ہیں نثر نگاری میں عیب بھی سمجھی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر شاعری کے بنیادی عناصر جذبہ اور تخیل ہیں۔ نثر میں بھی جذبے اور تخیل سے کام لیا جاتا ہے لیکن بہت کم۔ نثر میں عقل اور منطق سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ شاعری کی جذباتیت (sentimentality) نثر میں عیب قرار پاتی ہے۔ شاعری کا کام اگر دل کو متاثر کرنا سمجھا جاتا ہے تو نثر کا کام ذہن کو تسخیر کرنا ہے۔ نثر میں الفاظ کے حسن وشوکت سے زیادہ متن کو اہمیت حاصل ہے۔ اس کو یوں دیکھا جاسکتا ہے کہ دنیا کے تمام ادبیات میں شاعری نثر سے پہلے بحیثیت ادب وجود میں آئی کیونکہ شاعری جذبے کا اظہار ہے۔ حیرت، غم، خوشی، غصہ، خوف بنیادی جذبات ہیں جو انسان کو ابتدائی قبائلی زندگی سے متاثر کررہے ہیں۔ اس کے برعکس نثر اس وقت وجود میں آئی جب معاشرہ سماجی اور ارتقائی منزلیں طے کر چکا اور اسے انفرادی اظہار کے بجائے سماجی اور اخلاقی تفہیم کی ضرورت پیش آئی، لیکن شاعری کے مقدم ہونے کی وجہ سے یہی ہوتا رہا ہے کہ نثر پہلے پہل شاعری کا سہارا ضرور لیتی ہے۔ گویا شاعری کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھتی ہے مگر رفتہ رفتہ تمدن ومعاشرے کے ارتقاء اور سماجی اداروں کے زیادہ پیچیدہ عمل کی وجہ سے نثر اپنی مستقل حیثیت قائم کرلیتی ہے۔ غالب، حالی اور سرسید کی نثر اگرچہ فسانہ عجائب کی نثر کے مقابلے میں پھیکی نظر آتی ہے یعنی اس میں قافیہ، سجع اور مبالغہ کا چٹخارہ نہیں ہے لیکن دراصل یہی وصف غالب، سرسید اور حالی کی نثر

* اُستاد شعبہ اُردو، کراچی یونیورسٹی، کراچی

کو ترقی یافتہ نثر بناتے ہیں اوران بزرگوں کے یہاں نثر اپنی علیحدہ اقلیم قائم کرتی نظر آتی ہے۔آج اردو نثر نے اپنی علیحدہ حیثیت مستحکم کر لی ہے بلکہ اس کے اثرات شاعری پر پڑنے لگے ہیں۔

ادبی نثر شاعری سے علیحدہ ضرور ہے لیکن بنیادی تخلیقی اوصاف سے جدا بھی نہیں اور یہی تخلیقی اوصاف کسی نثر پارے کو ادب پارہ بناتے ہیں۔گویا ادبی نثر میں خواہ وہ انسانوی ادب ہو یا غیر انسانوی ادب، وہ خصوصیات موجود ہونا ضروری ہیں جن کو ہم تخلیقی ذہن کا عکس کہتے ہیں۔طنز ومزاح یا ظرافت دراصل اسی تخلیقی ذہن کی ایک صلاحیت ہے جو ادب کا حصہ بن جاتی ہے اس میں نثر یا نظم کی حد بندی نہیں ہے۔طنز ومزاح اظہارِ بیاں کا، فکر اور سوچ کا جزو ہے جس کی نثر اور شاعری دونوں میں عمدہ مثالیں موجود ہیں۔

جعفر زٹلی سے لے کر اکبر الٰہ آبادی تک اور پھر آج تک کئی شاعر ایسے ہیں جن کے کلام کی غالب خصوصیت طنز نگاری ہے۔جن شعراء کے ہاں طنز نگاری غالب خصوصیت نہیں ہے مثلاً غالب یا میر ان کے ہاں بھی اعلیٰ درجے کے طنزیہ اشعار موجود ہیں یہی حال نثر کا ہے۔نثر نگاروں میں ہمیں ایسے ادیب بھی ملتے ہیں جن کے ہاں طنز یا مزاح ایک غالب خصوصیت ہے اور ایسے سنجیدہ لکھنے والے بھی ہیں جن کی شہرت ان کے سنجیدہ خیالات کی وجہ سے ہے لیکن ان کے ہاں طنز کی بڑی اچھی مثالیں موجود ہیں۔اس کی سب سے اہم مثال سرسید احمد خان کی ہے۔سرسید کی نثر کی بنیادی خصوصیت سنجیدگی ہے لیکن انکی ایسی تحریریں بھی ہیں جو اہم طنزیہ حیثیت رکھتی ہیں۔

اُردو ادب میں ابتدا سے طنز ومزاح کی مثالیں ملتی ہیں۔داستانوں اور قصہ کہانیوں میں کئی ایسے مزاحیہ کردار ہیں جو نسل در نسل ایک روایت کی صورت میں منتقل ہو رہے ہیں مثال کے طور پر شیخ چلی یا ملا نصیرالدّین یا عمرو عیار کا کردار، ایسے کردار ہیں جن کے ساتھ مزاح کی روایت بھی وابستہ ہے۔طلسم ہوش ربا، فسانہ عجائب، رانی کیتکی، تو تا کہانی وغیرہ سب ہی داستانوں میں طنز ومزاح کے عناصر موجود ہیں جدید دور کے نقطۂ آغاز پر ناول اور داستان کی درمیانی کڑی، رتن ناتھ سرشار کے ناول، ''فسانہ آزاد''، کی صورت میں ملتی ہے۔اس ناول میں سنجیدہ مباحث بھی ہیں لیکن ظریفانہ مرقع نگاری اس کی جان ہے۔اس نے اُردو ادب کو خوجی جیسا لافانی کردار بھی دیا۔'فسانۂ آزاد' سے پہلے غالب کے خطوط کو وہ مقام حاصل ہے جہاں نہ صرف موجودہ نثر کی بنیادیں استوار ہوتی نظر آتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ طنز ومزاح کی بھی ایک بلند کیفیت نظر آتی ہے۔ایسی بلند کیفیت جس کے نمونے آج تک شاذ ونادر ہی ملتے ہیں۔

غالب کے بعد سرسیّد، نذیر احمد دہلوی، اودھ پنچ اخبار کے مصنّفین، سرشار اور ان کے بعد فرحت اللہ بیگ، محفوظ بدایوانی، سلطان حیدر جوش، عظیم بیگ چغتائی، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، شوکت تھانوی، ملا رموزی سے ہوتی ہوئی اُردو نثر کی طنز ومزاح کی روایت بالآخر پطرس، رشید احمد صدیقی، امتیاز علی تاج، شفیق الرحمٰن، کرشن چندر،

ابن انشاء، کرنل محمد خان کنہیالال کپور، محمد خالد اختر اور مشتاق احمد یوسفی تک پہنچی۔ ان سب مزاح نگاروں کے مطالعے سے یونانیوں کے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ ٹریجڈی اور کامیڈی ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں۔

''کامیڈی کا مقصد انسانوں کو اس سے برتر دکھانا ہے۔ جیسا کہ وہ آج کل ہیں اور ٹریجڈی کا مقصد ان کو بہتر دکھانا ہے۔''(۱)

طنز ومزاح کا مطالعہ دراصل انتہائی سنجیدگی کا متقاضی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طنز ومزاح کا مقصد تفنن طبع ہے لیکن یہ ضروری نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مزاح کا رشتہ اگر طنز سے، جو انتہائی سنجیدہ عمل ہے، کاٹ دیا جائے تو اعلیٰ معیار برقرار رکھنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے اس اعلیٰ معیار پر پطرس بخاری کے علاوہ شاید ہی کوئی اور ہو جو پورا اتر سکے۔ گویا اعلیٰ درجہ کا مزاح عموماً طنز سے جڑا ہوتا ہے اور یوں مقصدیت سے بھی اس کا رشتہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

نذیر احمد ہوں، سرشار ہوں یا اکبر الہ آبادی، ابتدا سے ہی طنز ومزاح یا ظرافت میں مقصدیت کی جھلک موجود رہی ہے بلکہ جیسا کہ خود اکبر نے کہا کہ 'شاہد معنی نے پہنا ہے ظرافت کا لباس' گویا طنز ومزاح خصوصاً طنز نگاری ہمیشہ سے سماجی تنقید کا حربہ رہی اور ذہنی وتہذیبی ترقی کا ذریعہ بھی بنی۔ اس جگہ طنز اور مزاح کا فرق واضح کر دینا بھی ضروری ہے۔ مزاح تو لازمی طور پر ظرافت کا جزو ہے لیکن طنز ایک سنجیدہ عمل ہے جو ظرافت کے بغیر بھی اپنا وجود رکھتا ہے۔ اردو ادب کے کئی لکھنے والے ایسے ہیں جن کے ہاں طنز کے تو بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن وہ ظرافت نگاروں میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو طنز کا دائرہ نسبتاً وسیع ہو جاتا ہے۔

بیسوی صدی کا طنزیہ اور مزاحیہ اردو ادب، اس سے پہلے کی اردو میں ظریفانہ کاوشوں سے بھی مستفید ہوا ہے۔ اس کے ساتھ دنیا کے ادبیات میں اظہار خیال اور بیان کے اعتبار سے جو اضافہ ہوا ہے، اس کا بھی اردو کے طنز اور مزاحیہ ادب پر خاصہ اثر نظر آتا ہے۔ اس صدی کی ابتدا میں ہی عالمی اور مقامی، سیاسی، سماجی سطح پر زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں سے اردو ادب بھی متاثر ہوا اس دور میں ادبی سطح پر جو سب سے بڑی ترقی پسند تحریک کی صورت میں تھی۔

۱۹۳۶ء میں شروع ہونے والی ترقی پسند تحریک اگرچہ کئی نشیب وفراز سے گزری تاہم یہ حقیقت ہے کہ اپنے ابتدائی عہد میں ہی اسے بے پناہ مقبولیت ملی۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں نے طبقاتی کشمکش، معاشی جدوجہد، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، منافقت اور عدم مساوات کو موضوع بنایا۔ یہ تحریک دراصل اپنے عہد کے ذہنی انتشار، تنگ نظری اور عدم مساوات کے خلاف ایک ردِعمل تھا اور اسی لئے اس تحریک سے وابستہ ادیبوں نے خاص طور پر طنز نگاری کو شعار بنایا بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند لکھنے والوں نے طنز ومزاح کے بعض سماجی اہداف بھی مقرر کر دیے۔

اس کی اولین مثال پریم چند ہو سکتے ہیں۔ پریم چند کے ابتدائی افسانوں میں بھی طنز کی کچھ نہ کچھ جھلک ملتی ہے تاہم ترقی پسند تحریک کی طرف مائل ہونے کے بعد ان کی تحریروں میں طنز اور اسکے متعین سماجی اہداف دیکھے جاسکتے ہیں۔ ''کفن'' جو اردو افسانے میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے طنزیہ افسانہ ہے۔ پریم چند کے فن کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے طنز کا نشانہ کردار نہیں بنتے بلکہ معاشرہ بنتا ہے جو ایسے کرداروں کو پیدا کرتا ہے ''کفن'' کے کردار، جو بیوی کی آخری رسومات کے لئے جمع کی گئی رقم کی شراب پی جاتے ہیں، وہ اس معاشرے کے نمائندے ہیں جس میں منافقت مفت خوری اور ظلم عروج پر ہیں۔ طنز نگاری کی یہی وہ روایت ہے جسے بعد میں آنے والوں نے آگے بڑھایا۔

اختر حسین رائے پوری کے افسانوں میں بھی اس طنز کی جھلک ملتی ہے۔ علی عباس حسینی نے پریم چند کی طرح دیہات کی تصویر کشی کی اور وہاں کے ماحول کی ناہمواریوں کو اپنے طنز کا ہدف بنایا۔ احمد علی کو ''انگارے'' سے شہرت ملی جس کے بعد جلد ہی ان کے افسانوں کا مجموعہ ''شعلے'' بھی سامنے آ گیا: ''احمد علی نے ان افسانوں میں مٹتی ہوئی تہذیب پر جرأت و بیبا کی سے طنز کیا ہے۔''(۲)

حیات اللہ انصاری نے بھی اپنے افسانوں میں طنز کا حربہ استعمال کیا اور کہیں کہیں مزاح سے بھی کام لیا۔ کرشن چند کے افسانوں میں بھی طنز و مزاح کی جھلک ملتی ہے۔ 'گواہ'، 'تھالی کا بینگن'، 'شیطان کا استعفٰی'، 'پرانے خدا'، 'ان داتا' جیسے کئی افسانے طنزیہ انداز رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایسے مضامین بھی لکھے جو طنز و مزاح پر مبنی ہیں۔ افسانہ نگاری سے قطع نظر ان کی ظریفانہ نثر پر نظر ڈالی جائے تو ان کا پہلا مجموعہ ''ہوائی قلعے'' جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا، ظریفانہ مضامین پر ہی مبنی ہے یوں ''ان کی ادبی زندگی کا آغاز ظریفانہ مضامین سے ہوتا ہے۔''(۳)

اس کے بعد انہوں نے بے شمار طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے 'فلمی قاعدہ'، 'ایک گدھے کی سرگزشت'، 'گدھے کی واپسی' وغیرہ ان کی ظریفانہ تصانیف ہیں۔ کرشن چندر کو خوبصورت نقش نگاری کا جو سلیقہ ہے اور حقیقت کے ساتھ خیال آفرینی آمیز کرنے کی جو صلاحیت ہے وہ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین میں بھی ظاہر ہوتی ہے مثال کے طور پر 'اخباری جوتشی' میں لکھتے ہیں:

> ''چھٹی ریس میں ہندوستان اور پاکستان بہت اچھے گھوڑے ہیں بہتر یہ ہوگا کہ ہندو ہندوستان کھیلیں اور مسلمان پاکستان لیکن یہ دونوں گھوڑے ہارنے والے ہیں۔ اس ریس میں ساتویں نمبر کا جو گھوڑا دوڑ رہا ہے اس کا نام ہے ماونٹ بیٹن بس یہی گھوڑا جیتے گا۔''(۴)

کرشن چند کے طنز کا ہدف بھی دیگر ترقی پسند مصنّفین کی طرح معاشرتی ناہمواریاں اور منافقانہ رویے ہیں

ابتدائی مضامین میں ان کے ہاں طنز کا رنگ مزاح کے مقابلے میں ہلکا ہے لیکن وقت کے ساتھ طنز غالب آتا گیا اور بعض مضامین تو ایسے ہیں جنہیں خالص طنز کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

سعادت حسن منٹو کی تحریروں میں طنز ایک بنیادی وصف رکھتا ہے۔ان کے افسانے، ڈرامے، خاکے 'گنجے فرشتے' اور 'لاؤڈ اسپیکر' ہر جگہ ہمیں طنز کی وافر مقدار ملتی ہے۔افسانوں میں خصوصاً وہ افسانے جو فسادات اور تقسیم کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں، طنز سے بھرپور ہیں۔ان کا طنز بڑی حد تک انہی خطوط پر استوار ہے جن کی طرف ترقی پسند تحریک نے توجہ مبذول کرائی۔ جہاں انہوں نے ایسے افراد وطبقات کے خلاف قلم اٹھایا جو معاشرتی ناانصافیوں کے ذمہ دار ہیں۔وہاں ایسے افراد کو بھی موضوع بنایا جن کا ظاہر اور باطن ایک سا نہیں۔ پاکستان میں 'شہید سازی' کی صورتحال دیکھئے:

> ''آجکل میں ایک بہت بڑی عمارت بنوا رہا ہوں۔ٹھیکہ میری ہی کمپنی کے پاس ہے۔دو لاکھ کا ہے۔اس میں سے پچھتر ہزار تو میں صاف اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔بیمہ بھی کرا لیا ہے۔میرا اندازہ ہے کہ جب تیسری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ دھڑام گر پڑے گی کیونکہ مسالا ہی میں نے ایسا لگوایا ہے۔اس وقت تین سو مزدور کام پر لگے ہوں گے۔خدا کے گھر سے مجھے پوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائینگے لیکن اگر کوئی بچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ پرلے درجے کا گنہگار ہے، جس کی شہادت اللہ تبارک وتعالیٰ کو منظور نہیں۔''(۵)

افسانے 'اللہ کا بڑا فضل ہے' میں منٹو کا طنزیہ لہجہ دیکھئے:

> ''اللہ کا بڑا فضل ہے صاحبان، کوئی شاعر دیکھنے میں آتا ہے نہ موسیقار۔۔۔۔۔۔ لاکھ لاکھ شکر ہے پروردگار کا اب ہم پر ملاّوں کی حکومت ہے۔۔۔۔موسیقی کی خرافات بھی ختم ہو چکی ہے۔۔۔۔۔سچ پوچھیے تو اب وہ خوفناک حس ہی مٹ چکی ہے جسے طلبِ حسن کہتے ہیں۔''(۶)

اُردو افسانہ نگاروں میں شاید سب سے زیادہ منٹو نے ہی انسانی نفسیات کی نیرنگیوں کو اپنے افسانے میں پیش کیا ہے۔وہ ایسے کرداروں کو منتخب کرتے ہیں جنہیں سماج میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔اور پھر ان کرداروں کے باطن سے کوئی خیر، اچھائی، اجالے کا پہلو نکال لیتے ہیں اس کی مثال ان کے افسانے 'ہتک'، 'موذیل'، 'بابو'، 'گوپی ناتھ'، 'ممی' وغیرہ ہیں انسانی نفسیات سے منٹو کو غیر معمولی دلچسپی ہے اور اسی لئے منٹو کے طنز میں ایک اور جہت ابھرتی ہے اور وہ یہ کہ منٹو صرف معاشرے کی برائیوں کو طنز کا نشانہ نہیں بناتے بلکہ انسانی فطرت کی مختلف اور متغیر کیفیتیں بھی انہیں طنز کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

منٹو کی طرح عصمت چغتائی کا بھی ایک نمائندہ موضوع جنس رہا ہے اور طنز عصمت کے اسلوب کا بھی اہم

جزو ہے تاہم عصمت کا طنز دیگر مصنّفین سے کئی اعتبار سے مختلف اور ممتاز ہے۔عصمت کی بے باکی نے ان کے طنز کو دو دھاری تلوار بنا دیا ہے۔اس پر ان کی زبان دانی اور باغیانہ سوچ سونے پر سہاگہ ہے یوں ان سب چیزوں کے امتزاج سے عصمت کا طنزیہ لہجہ بنتا ہے جو ان کے افسانوں، ناولوں اور 'دوزخی' جیسے خاکے میں نظر آتا ہے۔سامراجی قوتوں پر عصمت کا طنز ملاحظہ کیجیے:

''انگریزی زبان میں یس، نو، ڈیم فول، سوائین کے سوا اور ہے کیا؟ حاکموں کا ان چند لفظوں میں ہی کام نکل جاتا ہے۔''(۷)

ایک عمر رسیدہ طوائف کی تصویر عصمت اپنے مخصوص انداز میں یوں کھینچتی ہیں۔

''کم بخت کو یہ بھی سوچنے کی فرصت نہیں کہ تنگ کپڑے پہننے کے دن کبھی کے جا چکے ہیں۔خمیری آٹے کو تسموں سے کسنے سے نہایت ناہموار سطح ہو جاتی ہے۔''(۸)

احمد ندیم قاسمی کے ترقی پسند افسانوں کا ماحول پنجاب کا دیہی ماحول ہے۔'میرا دیس'، 'نیم وادریچے'، 'الحمداللہ'، 'مامتا'، جیسے افسانوں میں احمد ندیم قاسمی نے سماج پر گہرے طنز کئے ہیں۔سجاد ظہیر، قاضی عبدالغفار، عزیز احمد، رامانند ساگر، فکر تونسوی، ابراہیم جلیس کے یہاں بھی طبقاتی کشمکش، معاشی بدحالی اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

ابن انشاء اگر چہ ترقی پسند ہیں تاہم ان کی ظرافت کا انداز دیگر ترقی پسند مصنفین سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ ان کی تحریروں میں طنز بہت ہلکا اور مزاح غالب ہے۔پطرس کے بعد بے ساختہ مزاح کہیں ملتا ہے تو ابن انشاء کے ہاں۔ان کے طرز اظہار کے دلنشینی ہی ان کو مزاح نگاروں میں اہم مقام دلانے کیلئے کافی ہے۔انشاء جی کی ذکاوت، ذہانت، اور خاص زاویہءنظر سے دیکھنے کی صلاحیت ان کے مضامین، سفرنامے، کالم، غرض ہر جگہ نظر آتی ہے۔تاہم ان کی ترقی پسندانہ فکر بھی اکثر جھلک ہی جاتی ہے۔ایک مثال دیکھیے۔اپنے چین کے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ

''ماوزے تنگ اور اس کے ساتھیوں کو جو عمر کے آخری مراحل میں ہیں اتنے کشٹ اٹھانے کی ضرورت نہ تھی۔مزے سے سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں موٹی موٹی رقمیں جمع کرا کے عیش کرتے۔جائیدادیں بناتے اور جب کبھی عوام کی طرف سے کوئی خطرہ پیدا ہوتا تو سات سمندر پار سے خدائی فوجداروں کو بلاتے کہ آؤ، فوجی اڈّے بناؤ اور اپنے وفاداروں کی پشت پناہی کا حق ادا کرو۔کچھ خود کھاؤ۔کچھ ہمیں کھلاؤ۔''(۹)

کنہیالال کپور، ترقی پسند تحریک کے نامور طنز نگار ہیں۔بڑی بات یہ ہے کہ وہ خود بھی ترقی پسند فکر رکھتے

ہیں، اور خود ترقی پسند فکر بھی ان کے نشانے پر آتی ہے۔ ادب میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اس کو کنہیالال کپور نے نشانہ بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ترقی پسند تحریک میں جو ناہمواری یا کجی تھی کنہیالال کپور نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ۔ان کا مشہور مضمون ''کامریڈ شیخ چلی'' اشتراکیوں پر طنز ہے۔ ''کافی ہاوس'' میں اشتراکیوں کے ساتھ ادیبوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ کنہیالال کپور فسادات کے بعد پاکستان سے ہندوستان پہنچے تو ان سب باتوں کا تذکرہ بھی انہوں نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان ساری تلخیوں کے باوجود ان کے ہاں ایک بے تعصبی موجود ہے۔ ''برج بانو'' میں، ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کے ساتھ جو ناز یبا سلوک کیا گیا اسے طنزیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے، اپنے زمانے کی تہذیبی، لسانی اور سیاسی صورت حال بھی اکثر کپور کے طنز کا نشانہ بنی ہے۔ یہ نمونہ دیکھئے:

> ''ایک عام ہندوستانی اپنے تمام آلام ومصائب کا ذمہ دار دو، اور صرف دو چیزوں کو ٹھہراتا ہے۔ یعنی انگریز اور قسمت۔''(۱۰)

محمد خالد اختر بھی ترقی پسند تحریک کے ہمنوا کہے جا سکتے ہیں لیکن ان کا انداز تحریر سب سے جدا ہے۔ محمد خالد اختر نے کئی اصناف میں لکھا لیکن ہر جگہ ان کی تحریر میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی شگفتگی ملتی ہے خاص طور پیروڈی یا تحریف میں وہ اپنے طنز کا کمال دکھاتے ہیں۔ ''چچا سام کے نام آخری خط'' میں جو منٹو کے معروف خط کی پیروڈی ہے ، لکھتے ہیں

> ''میرے غریب ملک میں سچ مانیے خدا اور اس کے رسول کے بعد جس قدر عقیدت مندی سے آپ کا نام لیا جاتا ہے کسی اور کا نہیں لیا جاتا۔ ہماری مسجدوں میں فقیہہ اور ملّا، اخباروں کے ایڈیٹر، اور مسلم لیگ کے لیڈر اب بھی اکثر خدا اور اس کے رسول کے نام کو زبان پر لاتے رہتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں جھانک کر دیکھئے تو ڈالر کھنکتے سنائی دیں گے۔''(۱۱)

ان کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی قوت متخیلہ ہے۔ طنز ومزاح میں بھی ان کے ہاں fantasy کا انداز نظر آتا ہے جس کی مدد سے وہ اشیاء کو نئی صورت دے دیتے ہیں۔ 'چاکیواڑہ میں وصال' اس کی مثال ہے۔ 'مکاتیب خضر'، 'بیس سو گیارہ' اور دو سفر ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ انہوں نے طنز ومزاح کو ایک نئی جہت عطا کی اور 'چچا عبدالباقی' جیسا کردار بھی دیا۔

مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند لکھنے والوں کے ہاں عموماً طنز، مزاح پر غالب رہتا ہے لیکن ان میں ابن انشاء جیسے خالص مزاح نگار، خالد اختر جیسے قوت متخیلہ کے حامل مصنف اور کنہیا لال کپور جیسے معروضیت رکھنے والے طنز نگار بھی ہیں۔ بیشتر ترقی پسند مصنّفین زندگی کے بارے میں ایک نقطہء نظر رکھتے ہیں ان کا طنز ومزاح

دراصل ان کے انداز نظر کی توضیح ہے۔ ان ترقی پسند مصنّفین کی وجہ سے نہ صرف طنز ومزاح کو فروغ ملا۔ بلکہ اس کے سماجی اہداف بھی مقرر ہوئے اور بے شمار نئے موضوعات اردو ادب کے ساتھ اردو کے ظریفانہ ادب کا حصہ بنے۔ حقیقت تو یہ ہے ترقی پسند مصنّفین کا بیشتر طنزیہ اور مزاحیہ ادب، ناولوں اور افسانوں میں بکھرا پڑا ہے اس ادب کا مجموعی اور انصاف پسندانہ جائزہ لینے کے لئے ایک مکمل کتاب کی ضرورت ہے۔ تاہم اس مختصر جائزے سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ ترقی پسند مصنّفین کے تذکرے کے بغیر اُردو ادب میں طنز ومزاح کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مترجم) ارسطو، ارسطو سے ایلیٹ تک، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، جون ۱۹۷۷، ص ۹۱

۲۔ انور سدید، اُردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۱ء، ص ۵۲۳

۳۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علیگڑھ ۱۹۱۴ء، ص ۱۲

۴۔ کرشن چندر، کرشن چندر کے مزاحیہ افسانے، لاہور، ص ۳۰

۵۔ منٹو، شہید ساز، نمرود کی خدائی، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۵۰ء، ص ۱۳۹

۶۔ منٹو، اللہ کا بڑا فضل ہے، اوپر نیچے اور درمیان، گوشۂ ادب، لاہور، ص ۲۳۔۲۰

۷۔ عصمت چغتائی، ہندوستان چھوڑ دو، دو ہاتھ، لاہور: شیش محل کتاب گھر، ۱۹۶۶ء، ص ۶۸

۸۔ عصمت چغتائی، پیشہ، ایک بات، لاہور: مکتبہ اُردو، ص ۱۳۱

۹۔ ابنِ انشا، چلتے ہو تو چین کو چلیے، کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۲۵

۱۰۔ کنہیّا لال کپور، ایک عام ہندوستانی، لاہور: تیشہ وشیشہ، ۱۹۵۱ء، ص ۵۱

۱۱۔ محمد خالد اختر، چچا سام کے نام آخری خط، کھویا ہوا افق، لاہور: مکتبہ جدید، ص ۸